ڈاکٹر یاسمین سلطانہ
استاد شعبہ اردو، اردو یونیورسٹی، کراچی

مجید امجدؔ کا شعری وفور اور تلخیٔ دوراں: ایک محاکمہ

Dr. Yasmeen Sultana
Department of Urdu, Urdu University, Karachi

Majeed Amjad and Bitterness of Life: A Discussion

Revolutionized condition after the middle of the 20TH Centuries had brought about great changes in Art and poetry. Versification had become modernized. Majeed Amjad is a prominent name among modern poets. He started poetry in a general manners but soon acquired a distinctive style of his own. Since he was not associated with any movements. Amjad instead of following some one had his own unique philosophy regarding to poetry. Mjeed Amjad is a poet of man's universal and internal distresses. That is way the apparent bitterness in his poetry either due to his own personal discontents or else it is due to the unpredictability of the world and the futility of life.

بیسویں صدی کے وسط کے بعد اردو کے شعری ادب میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ حالات تیز رفتاری سے بدل رہے تھے۔ عقائد اور تصورات میں انتشار پیدا ہو رہا تھا۔ بنے بنائے راستوں اور روایتوں پر آنکھ بند کر کے چلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ نفسیاتی پیچیدگیاں بڑھ گئیں تھیں۔ فرد بحیثیت فرد اپنے عمل و خیال میں آزاد نہیں رہا۔ یہ تغیر پذیر حقائق اپنی گرفت مضبوط کرتی جا رہی تھی۔ سائنسی اور صنعتی ترقی نے انسانی ذہنوں میں بیک وقت انسانی عظمت اور بے بسی کے متضاد رجحانات پیدا کر دیے تھے۔ ان حالات نے شعر و فن میں زبردست تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان تاریخی و سماجی تغیرات کے نتیجے میں اردو ادب میں جدیدیت پیدا ہونے لگی۔ داخلی تاثرات کا اظہار ہو یا زندگی کے وسیع تر مظاہر کا نقش، شاعری ہمیشہ قاری و سامعین کی توجہ کا مرکز رہی ہے کیونکہ اس میں کسی نہ کسی قسم کی جذباتی، ذہنی و فکری ردِعمل پیدا ہوتا ہے۔ اس نئے رجحانات کا جائزہ لیں تو اس

جدیدیت نے اردو نظم کو خاص طور پر متاثر کیا۔ اردو نظم میں یہ تبدیلی ن۔م۔راشدؔ، میراجیؔ اور حامد مدنیؔ وغیرہ کے بدولت ظہور پذیر ہو چکی تھی البتہ چند دوسرے شعراء نے بھی اس جدیدیت میں اپنا اہم کردار ادا کیا، مجید امجدؔ ان میں سے ایک ہیں۔

مجید امجدؔ کی نظم نگاری کا آغاز عمومی اور رواجی انداز میں ہوا۔ یہ انداز تخلیق کار کو انتخاب کا موقع دیتا ہے نہ حق محض قبولیت کا رویہ پروان چڑھاتا ہے۔ موج تبسم، اقبال، حسن، جوانی کی کہانی، محبوب خدا سے، حالی اور بعض دیگر نظموں میں مجید امجدؔ ۱۹۳۰ کی دہائی کے تابع نظر آتے ہیں۔ عمومی اور رواجی انداز کے تحت انھوں نے صرف چند برس ہی نظمیں لکھیں اور پھر نظم نگاری کا ایک ایسا اسلوب اختیار کر لیا جو ان کا اپنا تھا۔ بجا کہ عمومیت سے انفرادیت کی طرف ان کا سفر اچانک نہیں، رفتہ رفتہ طے ہوا ہے، مگر ان کی یہ پیش قدمی ادھوری نہیں مکمل ہے۔ [۱] جس زمانے میں مجید امجدؔ نے شاعری شروع کی اکثر شعراء میراجی، راشد اور فیض کی تقلید کر رہے تھے لیکن مجید امجدؔ میدان شاعری میں تنہا کھڑے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے نہ کسی کی تقلید کی اور نہ کسی کو اپنی تقلید کرنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے کسی ادبی تحریک سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا۔

مجید امجدؔ ایک حساس شاعر تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جو کردار ابھر کر سامنے آتا ہے وہ ایک شدید دکھی انسان کا کردار ہے۔ دراصل مجید امجدؔ انسان کے ازلی اور آفاقی دکھوں کا شاعر ہے، وہ دکھ جو بلاتفریق مذہب و ملت و رنگ و نسل ہر جگہ محسوس کیا جاتا ہے۔ وہ گزری رتوں، ڈھلتی شاموں اور اداس راتوں کا شاعر ہے۔ وہ بچھڑے دنوں، پرانی برساتوں، ادھوری ملاقاتوں اور تنہا چاندنیوں کا شاعر ہے۔ زوال اضمحلال اور تنہائی کا جان لیوا احساس مجید امجدؔ کی شاعری کا بنیادی اور مرکزی نقطہ ہے۔ اپنا زوال، کائنات کا زوال، شئے کا زوال۔ مجید امجدؔ کا احساس زوال، اضمحلال و تنہائی کبھی اس کی اپنی ذاتی محرومیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں سے جنم لیتا ہے اور کبھی عالم اشیاء کی مجموعی بے ثباتی و ناپائیداری اور زندگی کی مجموعی بے حاصلی و بے مصرفی کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ [۲]

تنہائی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ شعراء کرام کا یہ محبوب موضوع اپنے اندر اتنی جاذبیت رکھتا ہے کہ ان کے کلام کو جاوداں کر دیتا ہے۔ تنہائی ایک ایسا نفسیاتی عمل ہے جو انسان کو پیس کر رکھ دیتا ہے۔ مجید امجد کی شاعری میں ہمیں تنہائی کا کرب مختلف زاویے سے نظر آتا ہے۔

دل نے ایک ایک دکھ سہا تنہا
انجمن انجمن رہا تنہا
ڈھلتے سایوں میں تیرے کوچے سے
کوئی گزرا ہے بارہا، تنہا
تیری آہٹ قدم قدم۔۔۔اور میں
اس معیت میں بھی رہا، تنہا [۳]

مجید امجدؔ اپنے علاوہ دوسری مخلوق میں بھی تنہائی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ وہ بن میں اکیلی تنہا چڑیا کو دیکھتے ہیں تو تنہائی اور ویرانی کے

اعتبار سے بالکل اپنی مثال معلوم ہوتی ہے۔ وہ بھی شاعر کی طرح اپنی تنہا ویران اور اجاڑ زندگی کے غم ہستی کی نغمہ خوانی کرتی ہے۔

صبح سویرے بن کی چڑیا من کی بات بتائے
جنگل میں سرکنڈوں کی کونپل پر بیٹھی گائے
کیا گاتی ہے؟ کیا کہتی ہے؟ کون اس بھید کو کھولے؟
ظالم تنہائی کا جادو ویرانوں پر کھیلے
دور سرایوں کی جھلمل روحوں پر آگ انڈیلے
نوک نوک، خار کھلنڈرے ہرنوں کو کلپائے
گانے والی چڑیا اپنا راگ الاپے جائے۔ ۴

KEATS (کیٹس) کے خیال میں شاعری اپنی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے تخیل کی مدد سے جس چیز کا روپ چاہے دھار لیتا ہے اور وہی کچھ محسوس کرنے لگتا ہے جو وہ چیز محسوس کرتی ہے۔ وہ اس چیز کو NEGATIVE COPABILITY (منفی یا انفعالی صلاحیت) کہتا ہے۔۵ یہی وجہ ہے کہ مجید امجد نے چڑیا کو تنہا دیکھا تو چشمِ تصور میں خود چڑیا بن کر چڑیا کی تنہائی کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتا ہے۔ یہی کیفیت اس کی نظم ''پنواڑی'' میں ظاہر ہوتی ہے جب وہ پنواڑی کے اس دکھ کو محسوس کرتا ہے جو اسے دنیا کی بے مرّوتی اور فنا کی قوت کے سامنے بے بس اور مجبور کر دیتا ہے۔

بوڑھا پنواڑی اس کے بالوں میں مانگ ہے نیاری
آنکھوں میں جیون کی بجھتی اگنی کی چنگاری۔۔۔
دو دن ایک پھٹی چادر میں دکھ کی آندھی جھیلی
دو کڑوی سانسیں لیں دو چلموں کی راکھ انڈیلی
اور پھر اس کے بعد نہ پوچھو، کھیل جو ہونی کھیلی
پنواڑی کی ارتھی اٹھی، بابا اللہ بیلی
ایک چتا کی راکھ ہوا کے جھونکوں میں کھو جائے
شام کو اس کا کمسن بالا بیٹھا پان لگائے ۶

مجید امجد کے شعری تلازمات جن کرداروں کو سامنے لاتے ہیں وہ انسانوں کے مختلف گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ زیادہ تر کردار ایسے ہیں جو معاشرے کے کسی بلند مقام کے حامل نہیں سمجھے جاتے۔ یہ کردار اپنے اپنے مسائل میں گھرے زندگی کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ شاعر ان کرداروں کی روح میں اتر کر ان کے کرب کو محسوس کرتا اور بیان کرتا ہے۔ کبھی وہ ایک پنواڑی کا روپ بھرتا ہے تو کبھی بھکارن، کبھی کسان، کبھی گڈریا، کبھی مزدور۔ اسے ان کرداروں میں اپنا ہی عکس نظر آتا ہے۔

سرخ پھولوں سے لدی ایک ٹہنی
آن کر بجھ گئی ہے رستے پر
کنکروں پر جبیں رگڑتی ہے
راہگیروں کے پاؤں پڑتی ہے ۷

شام کی راکھ میں لتھڑی ہوئی ڈھلوانوں پر
ایک ریوڑ کے تھکے قدموں کا مدھم آہنگ
جس کی ہر لہر دھندلکوں میں لڑھک جاتی ہے ۸

جس جگہ اٹھتی ہے یوں مزدور کے دل سے فغاں
فیکٹری کی چمنیوں سے جس طرح نکلے دھواں
جس جگہ دہقاں کو رنجِ محنت کوشش ملے
اور نوابوں کے کتوں کو حسیں پوشش ملے ۹

مجید امجد کی شاعری میں نہ صرف نچلے طبقے کے حالات کی چکی میں پسے کردار شامل ہیں بلکہ دوسری مخلوقات کے ساتھ بھی ان کی بھرپور ہمدردی شامل رہی ہے۔انھیں جانوروں کا درد بھی اپنے درد سے مشابہ نظر آتا ہے۔مثلاً چڑیا، کبوتر، بیل، گھوڑا وغیرہ

کاش یہ حیراں کبوتر جانتے
خفتہ ہے ان کاغذوں کی سطح پر
کتنے پھنکتے آشیانوں کا دھواں
کتنے نخچیروں کی آہوں کے شرر
ہیں ان آوازوں کے اندر پرکشا
یہ کبوتر، دیکھتے تھکتے نہیں
دیکھتے ہیں۔سوچتے ہیں۔کیا کریں
یہ مفکر کچھ سمجھ سکتے نہیں۔ ۱۰

ان کرداروں کے ساتھ مجید امجد کا رویہ نرم یا بھیک دینے کا نہیں ۔اس نے ان کرداروں میں اپنی ذات کا عکس دیکھا،ان کرداروں میں اپنی ذات کی شناخت کے عمل نے شاعر کو جو لہجہ دیا ہے اس میں دنیا کو دوسرے کی آنکھ سے دیکھنے کا

ڈرامائی اظہار نمایاں ہے۔ مجید امجد کی شاعری میں اشیاء یا مصروفیت سے جو رشتہ قائم ہوتا ہے وہ محض انسانوں یا جانوروں سے استوار ہونے والا رشتہ نہیں ہے۔ یہ رشتہ فطرت کے مظاہر یعنی اشجار، پھولوں، شاخوں وغیرہ سے بھی استوار ہو گیا۔ ۱۱

درختوں کے اس جھنڈ سے جب میں گزرا،
خشک چھاؤں کی ٹکڑیاں سی مرے جسم پر تھرائیں
مرے جسم سے گر کر ٹوٹیں
عجب اک اچھوتی سی ٹھنڈک مری روح میں سرسرائی ۱۲

وہ سرسبز پیڑ جن کے سایے میں بیٹھ کر شاعر خوشی سے سرشار ہو جایا کرتا تھا۔ جس کی ٹھنڈک اس کی روح میں اتر جاتی تھی شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر ان پیڑوں کو کاٹنے کا عمل شروع ہوا تو شاعر کو یہ شہر ہی مقتل نظر آنے لگا جہاں ان درختوں کے کٹنے کے بعد خود اسے بھی قتل ہونے کا انتظار تھا۔

گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیل دیوار
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک، اے آدم کی آل ۱۳

دراصل اس نظم میں مجید امجد نے میکانکی زندگی کے پھیلنے کے ساتھ انسان کی شخصیت کی نمو اور شادابی کے گم ہونے کی داستان بیان کی۔

نچلے طبقے کے کرداروں میں سب سے بہترین کردار اچھوت ماں کا ہے۔ یہ کردار اسی استحصال شدہ معاشرے کا ایک کردار ہے۔ جہاں اونچ نیچ، امیری غریبی، ذات پات نے اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے۔ اس نظم میں مجید امجد نے ایک اچھوت ماں کی نظر سے خدا اور زر پرست اونچی ذات والوں کا تصور پیش کیا ہے۔ اچھوت ماں کے لیے خدا، اس کی مظلوم ذات کا آسرا بھی ہے اور خود خدا مظلوم بھی ہے۔ کیونکہ جس معاشرے نے اسے نچلی ذات کی اچھوت ماں قرار دے کر دور رکھا ہوا ہے اور مظالم کا سزاوار قرار دیا ہے، اسی طبقے نے خدا کے تصور کا بھی استحصال کیا ہے۔ اس لیے اسے اپنی اور خدا کی تقدیر یکساں معلوم ہوتی ہے۔

یہ اس بھگوان کے دامن کو چھو لینے سے ڈرتے ہیں
یہ اس کو اپنے محلوں میں جگہ دینے سے ڈرتے ہیں
کسی نے بھول کر اس کا بھجن گایا، یہ جل اٹھے
کہیں پڑ گیا اس کا حسین سایا، یہ جل اٹھے
غلط کہتا ہے تو نادان تو نے اس کو دیکھا ہے

مرے بھولے! ہماری اور اس کی ایک لیکھا ہے۔ [14]

مجید امجد نے اپنی نظموں میں استحصال شدہ معاشرے کی تصویر کشی کی ہے۔ انھیں طبقاتی فرق کے نتیجے میں پیش آنے والے مسائل کا ادراک تھا۔ وہ پیداواری نظام کے اس ڈھانچے کی نشاندہی کرتے ہیں جس پر یہ استحصالی نظام قائم ہے اور مضبوط و مستحکم ہے۔

خدا اس کا، خدائی اس کی، ہر شئے اس کی، ہم کیا ہیں!
چمکتی موٹروں سے اڑنے والی دھول کا ناچیز ذرہ ہیں۔
یہ نو نمبر کی بس جانے کب آئے گی؟ [15]
یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دنیا
گناہوں میں لتھڑے رواجوں کی دنیا
یہاں پر کلی دل کی کھلتی ہیں۔ [16]

مجید امجد معاش کو سامنے لاتے ہوئے نظامِ زر کو انسانوں کے دکھ کا ایک اہم سبب کے طور پر بھی پیش کرتے ہیں۔

کاش، تو حیلۂ جاروب کے پر نوچ سکے
کاش تو سوچ سکے ، سوچ سکے۔

آخر وہ اس طبقاتی نظام کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ انھیں لگتا ہے وہ معاشرے کا یہ نظام نہیں بدل سکتے۔ جب حق کا ساتھ دے کر باطل کو فنا کرنا مشکل ہو جائے اور طبقاتی نظام کا باطل رویہ زندگی پر اثر انداز ہونے لگے تو انسان بے بس اور پریشان ہو کر کراہ اٹھتا ہے جیسا نظم ''شاعر'' میں مجید امجد کا لہجہ ہے۔

مگر ہائے ظالم زمانے کی رسمیں
ہیں کڑواہٹیں جن کی امرت کے رس میں
نہیں میرے بس میں، نہیں میرے بس میں۔ [17]

یہ طبقاتی فرق دھیرے دھیرے شاعر کے حواسوں پر مسلط ہونے لگتا ہے۔ اور وہ احساس محرومی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی عمدہ مثال ان کی معروف نظم ''آٹو گراف'' ہے۔ جس میں شاعر بڑے حسرت سے اس کامیاب کرکٹر کو دیکھتا ہے جو حسینوں کے جھرمٹ میں گھرا انھیں آٹو گراف دیتا ہے۔ اس وقت اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اس کرکٹر سے حسد نہیں کرتا بلکہ خود اپنے دل کی بیاض لیے اس فنکار کی تلاش میں ہے جس نے اسے اجنبی اور بے نشان کر رکھا ہے۔ وہ خود کو ورق خالی کی طرح کسی آٹو گراف کا منتظر پاتا ہے۔ اس نظم میں مجید امجد کا ذاتی آشوب سامنے آتا ہے وہ اپنے فن کی ناقدری کا اظہار اس پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔

کھلاڑیوں کے خود نوشت دستخط کے واسطے

کتابچے لئے ہوئے

کھڑی ہیں منتظر۔۔۔۔حسین لڑکیاں!

ڈھلکتے آنچلوں سے بے خبر، حسین لڑکیاں!

میں اجنبی میں بے نشاں

میں پا بہ گل

نہ رفعت مقام ہے، نہ شہرت دوام

یہ لوح دل! یہ لوح دم!

نہ اس پہ کوئی نقش ہے، نہ اس پہ کوئی نام ہے! [۱۸]

محبت کا تجربہ مجید امجد کے لیے زندگی بھر کا عذاب بن گیا۔انھوں نے محبت کی تو ہمہ تن سپردگی کے ساتھ۔

یہ زرد پنکھڑیاں جن پر صرف صرف ہوں میں

ہوائے شام میں مہکیں زرا جو تو چاہے

لیکن اپنی محبت کو گناہوں سے آلودہ ہونے سے بچائے رکھا۔وہ اپنی محبت کو پاکیزگی کا اعلی وارفع مقام پر دیکھنا چاہتے تھے۔

میری پاکیزہ جوانی صرف عصیاں ہو نہ جائے

جنس تقدیس وفا نایاب ہے تیرے بغیر [۱۹]

لیکن ان کی محبت بھی زمانے کی ناقدری کی بھینٹ چڑھ گئی۔انھوں نے دنیاداری نبھانے کے خاطر اپنی محبت قربان کر دی۔محبت کی یہ ناکامی ان کی ساری زندگی پر محیط رہی۔مجید امجد محبت میں شرکت کے قائل نہ تھے اس لئے اپنی منکوحہ کو اپنی زندگی اور دل میں وہ مقام نہ دے سکے جو صرف ان کی محبوبہ کے لیے تھا۔انھوں نے محبت کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ وہ ساری زندگی بیوی کے ساتھ ازدواجی تعلقات سے گریزاں رہے۔ [۲۰] انھوں نے طے کر لیا کہ اب ساری زندگی خوشیوں سے منہ موڑ کر رونا ہے اور آنسوؤں کا یہ نذرانہ اپنے محبوب کے قدموں میں ڈالنا ہے۔

میں روتا ہوں میرے آنکھ سے جو آنسو ٹپکتے ہیں۔۔۔

ابھی ان موتیوں کو عمر بھر دامن میں رولوں گا

اور آخر ان کو اک رنگین مالا میں پرولوں گا

ترے قدموں میں گر کر پریم مندر کی حسیں دیوی

اس مالا کو میں تیرے گلے میں لا کے ڈالوں گا

اور اپنی زندگی کے آخری مقصد کو پالوں گا [۲۱]

''کاش'' یہ وہ لفظ ہے جو اپنے اندر حسرتوں کا ایک سمندر چھپائے رکھتا ہے۔اس کاش کے پیچھے ایک پوری دنیا

آباد ہوتی ہے۔اس کاش میں ایک حسرت اظہار کا درد چھپا ہوتا ہے۔ یہ وہ درد ہے جو ہر دھڑکتے ہوئے دل میں سانس کی طرح جاری وساری ہے اور یہی دبی دبی حسرت کاش کا سہارا لے کر مجید امجد کی دلی خواہشوں کا اظہار بن گئی۔

کاش میں تیرے بن گوش میں بندا ہوتا ۲۲

کاش مری یہ قسمت ہوتی، کاش میں وہ اک پتا ہوتا ۲۳

مجید امجد محبت کے اس فلسفے پر ایمان رکھتے تھے جس میں محبت میں کسی دوسرے کی شرکت کو شرک وکفر قرار دیا جاتا ہے۔ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے اس افلاطونی تصورِ محبت کو دل سے عزیز رکھنے کا ہی نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ایک دوست اور اس کی محبوبہ کے خودکشی کے واقعے کے آرزومندانہ احساس کے تحت نظم کیا ہے اور اس نظم کا خاتمہ اس آرزو پر کیا ہے کہ

آؤ نا! ہم بھی توڑ دیں اس دامِ زیست کو

سنگ اجل پہ پھوڑ دیں اس جامِ زیست کو ۲۴

مجید امجد کی شاعری میں جو سب سے زیادہ تصور ابھرتا ہے، وہ ہے وقت۔اس تصورِ وقت سے ان کا تصورِ تاریخ جڑا ہے۔انھیں وقت کے تصورات سے نہیں، وقت کے اس عمل سے دلچسپی ہے، جو انسانی زندگی اور تاریخ میں وہ انجام دیتا ہے۔یوں تو انسانی تاریخ میں انسان کی ثقافتی، فکری، تخلیقی فتوحات بھی شامل ہیں، مگر مجید امجد انسانی تاریخ میں مقتدر ومحروم طبقات کی کہانی کو مرکزیت دیتے ہیں کیونکہ یہی وہ کہانی ہے جو ازل سے ابد تک دہرائی جارہی ہے۔ ۲۵ ان کی نظم ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' میں وہ صدیوں پرانی تہذیب میں بھی کسان کے دکھ کو محسوس کرتے ہیں۔

تین ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کی چھل بل

دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی، اک ہالی، اک ہل-----

کون مٹائے اس کے ماتھے سے یہ دکھوں کی ریکھ

ہل کو کھینچنے والے جنوروں جیسے اس کے لیکھ ۲۶

''مقبرہ جہانگیر'' بھی مجید امجد کی تاریخ کی طرف مراجعت کی مثال ہے۔اس نظم میں شاعر مقبرہ جہانگیر کے ساتھ مدفن مغل تہذیب کو یاد کرتا ہے۔

ان کے سائے ہیں کہ ڈھلتی ہوئی تہذیبیں ہیں----

مرمریں قبر کے اندر، تہ ظلمات کہیں

کرمک ومور کے جبڑوں میں سلاطیں کے بدن ۲۷

ہڑپہ کی تہذیب ہو یا مغل دور کے سلاطین کا دبدبہ سیل زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر تھی کہ سارا غرور و دبدبہ خاک میں مل گیا۔

سیلِ زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر تھی

تخت و کلاہ و قصر کے سب سلسلے گئے ۲۸

محرومی جب حد سے بڑھتی ہے اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو انسان صبر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مجید امؔجد کے یہاں بھی محرومی انقلاب میں نہیں بدلتی بلکہ ان کا بنیادی رویہ صبر و قناعت کا ہو جاتا ہے۔ ایسا صبر و قناعت جو ظلم کی صورت حال میں چپ رہنے اور خاموشی سے دکھ سہنے کا مترادف نظر آتا ہے۔ جب وہ بالائی طبقے کی بے حسی دیکھتے ہیں تو غریبوں کی ان چھپروں کی تعریف کر کے انھیں تسلی دیتے ہیں جن میں محبت پائی جاتی ہے، دل سے دل کی باتیں ہوتی ہیں

یہ زخمی روحیں، یہ دکھتے دل، یہ جلتے سینے

کوئی انھیں سمجھائے جا کر، کوئی انھیں بتلائے۔۔۔۔۔۔

تم خوش قسمت ہو ان آنکھوں سے جن کی تنویریں

سونے چاندی کے ایوانوں میں، مرگھٹ کے سائے

وہ چھپرا چھے، جن میں ہوں دل سے دل کی باتیں

ان بنگلوں سے جن میں بسیں گونگے دن، بہری راتیں ۲۹

تقسیم ہند برعظیم کے مسلمانوں کے لیے ایک ایسا واقعہ ہے جس کی اذیتوں سے کوئی حساس دل اپنا دامن نہ بچا سکا، بالخصوص فن کار و ادیب۔ مجید امؔجد کے لیے تقسیم ہند ایک تجربہ نہیں مشاہدہ تھا۔ انھوں نے کسی تحریک میں باقاعدہ شمولیت اختیار نہیں کی لیکن اٹھتے ہوئے طوفان سے بے خبر نہ تھے۔ مجید امؔجد اس عمل سے بخوبی واقف تھے کہ جب ستم حد سے بڑھ جائے تو غلامی کی زنجیر ٹوٹ جاتی ہے۔ بغاوت جنم لیتی ہے تب ہی آزادی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن اس آزادی کو حاصل کرنے کے لیے جس تکلیف دہ حالات سے گزرنا تھا اس کا بھی انھیں اندازہ تھا، اس لیے وہ کہتے ہیں

سرمائے کے نظام کا انجام ہے قریب

اب اس کی زندگی ہے کہ ہستی حباب کی۔۔۔۔۔

پہنچا ہے اختتام پہ دورِ ملوکیت

حد بھی تو ہو کوئی ستمِ بے حساب کی

امؔجد تو آنے والے تغیر کو بھانپ جا

مستقبلِ مہیب کی ہیبت سے کانپ جا ۳۰

تقسیم کے بعد ہجرتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسلمان پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے تو پاکستان میں موجود ہندو ہندوستان کی طرف۔ جس طرح مسلمان بے سروسامان لٹے ہوئے قافلے کی شکل میں پاکستان ہجرت کر رہے تھے اسی طرح ہندو اپنے مال و اسباب چھوڑ کر ہندوستان جا رہے تھے۔ مجید امؔجد کو ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے متروکہ مکان کی بے

بسی پر ترس آتا ہے کیونکہ لٹے ہوئے مسلمان جب ہجرت کی صعوبتیں اٹھا کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو رہائش کا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے اس کے لیے ہندو امرأ کے عالیشان متروکہ محلوں کے دس حصے کر کے دس خاندان رہائش اختیار کرتے ہیں۔ محلوں کے اندر کھنچنے والی دیواریں مجید امجد کو اپنے دل میں کھنچتی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ صدیوں سے قائم ہندو مسلم اتحاد کو ٹوٹتے دیکھ کر آزردہ ہو جاتے ہیں۔

یہ محلے، یہ گھروندے، یہ جھروکے، یہ مکان
ہم سے پہلے بھی یہاں
بس رہے تھے سکھ بھرے آنگن، سنہری بستیاں۔۔۔۔۔
اک اٹل ہونی کی زنجیروں میں جکڑے قافلے
ساتھ لے جاتے اسے
بات صرف اتنی کہ اس دیوار کے پاؤں نہ تھے ۳۱

آزادی کے بعد پاکستان کو جس بڑے امتحان سے گزرنا پڑا وہ تھا سقوطِ ڈھاکہ۔ سقوط ڈھاکہ جنگ آزادی سے زیادہ تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ وہ اس سانحہ کا ذمہ دار سرمایہ پرست، سامراج دوست اور عوام دشمن حکومت کو ٹھہراتے ہیں جو عوام کا استحصال کر رہی تھی۔ بھارت نے جس طرح عالمی سامراج کا ہر دل دستہ بن کر مشرقی پاکستان میں ننگی جارحیت کا ارتکاب کیا، سقوط ڈھاکہ کے بعد بنگالی عوام کا تاریک مستقبل اور پاکستان میں غریبوں امیروں اور دانشوروں کی طرح طرح کی بحثیں، وہ سب کا جائزہ لیتے ہیں۔

ان سالوں میں
سیہ قتالوں میں
چلی ہیں جتنی تلواریں بنگالوں میں
ظالم آنکھوں والے خداؤں کی ان چالوں میں
دکھوں، وبالوں میں
قحطوں کالوں میں
کالی تہذیب کی رات آئی ہے اجالوں میں ۳۲

مجید امجد کے لیے نظام زر انسانوں کے دکھ کا ایک اہم سبب ہے۔ وہ باقاعدہ کسی تحریک میں شریک ہونے کے بجائے عوام الناس کے ہجوم اور اس کی جدوجہد میں اس عام آدمی کی حیثیت سے شرکت کرتے ہیں جسے ایک نیا عالم بسنے اور ایک نئی دنیا آباد ہونے کے مژدے سے زیادہ اس بات سے دلچسپی ہے کہ
نو نمبر کی بس کب آئے گی!

یوں وہ ایک طنز کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ جب تک نئے نظام اور نئے انقلاب، گلی سے گزرنے والے ایک عام آدمی کا مقدر نہیں بدلے، ہر نظام ڈھکوسلا اور ہر انقلاب فریب ہے۔

ان فصیلوں سے گھرا ہے چار سو
اک مرا اجڑا سا شہر آرزو
کوئی اس دنیا کا بھی بدلے نظام ۳۳

ان کے نزدیک اس نظام کا ذمہ دار خود انسان ہے۔ وہ اپنی کوتاہیوں اور بے عملیوں کی وجہ سے اس سامراجی نظام کی چکی میں پس رہا ہے۔ انسان سیاسی جبر یا معاشی مصائب کا اس لئے ذمہ دار ہے کہ وہ ان کی روک تھام کے لیے اتحاد، قوت اور شعور سے اکتساب فیض نہیں کرتا۔ وہ خود بھی قربانی دیتے ہیں اور انسان کو قربانی کے جذبے کی طرف راغب کرتے ہیں، قربانی جو انسانی نشونما اور بقا کے لیے ضروری ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فرد کو محض اپنی ذات کے قید خانے میں جلاوطنی کی زندگی نہیں گزارنی چاہیے بلکہ سماج کے وسیع منظرنامے میں تحلیل ہو کر اسے اپنے اندر تحلیل کر لینا چاہیے۔

اس کرے کے جوف سے ہم نے کشید کیا
انگاروں سے بھرا ہوا سیال غرور
لیکن کس کی تھی یہ مٹی؟ ہم سب کی!
اس مٹی کی وریدوں سے یہ کھچا ہوا سیال غرور
سب میں بٹ جاتا
تو یہ دیس دنوں کے سجدوں میں بس جاتا ۳۴

شاعر جب اس معاشی نظام زر کے خلاف بغاوت کی آواز بلند کرتا ہے، لوگوں کو آمادہ کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ غیر طبقاتی سماج کا خواب دیکھتا ہے۔ لیکن جب ان کاوشوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تو شاعر شدید اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی آواز دم توڑ دیتی ہے تو اس کی راکھ سے انسانی انا کی آواز جنم لیتی ہے۔

میں بھی پلکوں میں امنگوں کے دیے لے کے گرجتے ہوئے طوفانوں میں
منتظر تھا کہ اچانک کہیں باغوں میں، بیابانوں میں
آ کے بس جائے کسی نغمہ شیریں کی بہار
یہ میرے گرد جو پھیلی ہوئی ویرانی ہے ۳۵

فنا ایک ایسا خوفناک احساس ہے جو ہر انسان کو گھیرے میں لیے رہتا ہے اور اسے حزن و ملال میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ہر ذی نفس کو شکست ہوتی ہے۔ موت ایک ایسا تصور ہے جو عام آدمیوں کی زندگی اور گفتگو میں اتنا نظر نہیں آتا جتنا ایک حساس طبعیت رکھنے والے تخلیقی ذہن کے فن کار کے فن میں نظر آتا ہے۔ مجید امجد کی نظموں میں موت اپنے ہر روپ

میں جلوہ گر ہے۔انھیں اس حقیقت سے مصالحت میں بے حد دقت پیش آتی ہے کہ انسانی وجود جیسی ارفع حقیقت فنا ہو جائے۔

میں جب سوچتا ہوں کہ انسان کا انجام
ہے مٹی کے ایک گھر کی آغوش آرام
تو سینے میں اٹھتا ہے اک دردِ بے نام ۳۶

موت دراصل ایک نا قابل بیان تجربہ ہے لیکن مجید امجد اسے تجربے کے بجائے ایک ایسی حقیقی صورت حال کے طور پر لیتے ہیں، جو ہر لحہ زندگی پر سایہ فگن ہے اور یہی بات ان کی نظموں میں غیر معمولی حزن پیدا کرتی ہے

کس کی خاطر، یہ ایک صبح ؟
کس کی خاطر آج کا یہ دن؟
کیسا دن؟
یہاں تو ہے بس ایک وہی اندھیر دنوں کا جس کی رَو
روحوں میں اور جسموں میں چکراتی ہے! ۳۷

مجید امجد کی شاعری میں حقیقی تلخی نہ غم زمانہ اور نہ سماجی ناقدری کا پیدا کردہ ہے بلکہ ان کے لہجے کی اصل تلخی وجود کے فنا ہو جانے کا احساس ہے۔انسانی وجود کی فنا پذیری کے یقینی احساس نے ان کی شاعری میں ایک کرب کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

کتنے اچھے ہیں یہ سب الجھیڑے،
سمے کی رو میں دھب دھب چلتے دھندے
کتنی بھلی اک یہ بے مصرف سی مصروفیت
ذہن پہ اک یہ پردہ، جس کے اوجھل ہیں وہ باتیں
جن کا دھیان بھی مجھ کو سب خوشیوں سے ناخوش کر سکتا ہے
دھیان ان کا، جن کے قدموں کے نیچے میرے باطن کی مٹی ہے
اک دن یہ مٹی ان کے قدموں کے نیچے سے سرک گئی۔۔تو۔۔ ۳۸

موت مجید امجد کو خوف زدہ نہیں کرتی کیونکہ ان کو اپنی زندگی بھی موت کے اندھیرے جیسی لگتی ہے

موت کتنی تیرہ و تاریک ہے
ہو گی، لیکن مجھ کو اس کا غم نہیں
قبر کے اندھے گڑھے کے اس طرف
اس طرف، باہر، اندھیرا کم نہیں ۳۹

انھیں زندگی اورموت کے اندھیرے خوف زدہ نہیں کرتے بلکہ یہ اندھیرے انھیں ذہنی اور تخلیقی سطح پر بیدار اور متحرک کر دیتے ہیں ۔ انھوں نے موت سے فرار حاصل کرنے کے بجائے ڈٹ کر موت کا سامنا کیا ۔آخر عمر میں انھیں اپنی کمزوری، عمر کے بڑھنے اور موت کے قریب آنے کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں

مجھ سے کہتی ہے کہ دیکھ ایک برس اور بجھا
دیکھ اب کے تری ہنستی ہوئی بتیسی پر
ایک دھبہ سا پڑا۔۔۔دانت جھڑا۔۔۔
لوگ کہتے پھرے اس شخص کو دیکھو، اب تو
اس کے ہونٹوں سے اب ایک وہ مرجھائی ہوئی موج تبسم بھی گئی
جب مری عمر کی پچاسویں پت جھڑ آئی ۴۰؎

فن کار کے لیے اس کا فن زندگی کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اسے مال و دولت کی نہیں مگر اپنے فن کی پزیرائی کی طلب ضرور ہوتی ہے۔ یہ ہمارا المیہ رہا ہے کہ ہمارے یہاں کسی بھی فن کار کو اس کی زندگی میں وہ پذیرائی نہیں ملتی جس کا وہ حق دار ہوتا ہے۔ یہ زیادتی مجید امجد کے ساتھ بھی ہوئی، ان کی زندگی میں ان کے فن کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کا وہ استحقاق رکھتے تھے۔ ان کا فن تعلقات، عہدے اور سماجی مراتب کے بھینٹ چڑھ گیا۔

ایک صاحب قلم پہ جو گزری میں کیا کہوں
نوک اس کے دل کو چیر گئی جس کٹار کی
اس پر گرفت تھی ستم روزگار کی ۴۱؎

مجید امجد ان فن کاروں میں سے نہیں تھے جنھیں شہرت کی شدید طلب ہوتی ہے اور وہ اپنی ناقدری پر قنوطی ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس مجید امجد اس محرومی سے پیچھا چھڑانا جانتے تھے ،انھیں احساس تھا، جنھیں وہ اپنا سمجھتے ہیں وہ کبھی ان کے فن کی قدر نہیں کریں گے، اس بے قدر ماحول میں کہیں ان کا فن گھٹ کر نہ رہ جائے

یہ سچ ہے اپنے جوہر کھو رہا ہوں دیس میں رہ کر
گزرتی زندگی کو رو رہا ہوں دیس میں رہ کر
اسی ماحول تک محدود ہے نغمہ میری نے کا
فضا کی تنگیوں میں گھٹ رہا ہے دم میری لے کا ۴۲؎

انھیں اس بات کا یقیں تھا کہ جس فن کو ان کے دیس میں پذیرائی نہیں مل رہی، غیر اس فن کی قدر کریں گے لیکن وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتے تھے کیونکہ اس کی مٹی سے انھیں محبت تھی۔

آفاق کی پنہائیاں آواز دیتی ہیں

مجھے دنیا کی بزم آرائیاں آواز دیتی ہیں
مگر میں چھوڑ کر یہ دیس پیارا جا نہیں سکتا
بھلا کر میں ان آنکھوں کا اشارہ جا نہیں سکتا ۱۶؎

ہنر اور اہل ہنر کی ناقدری کا رونا ہر زمانے اور ہر زبان کے ادب میں نظر آتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وقت کبھی نہ کبھی آدمی کو اس کا اصل مقام و مرتبہ ضرور دیتا ہے، مجید امجدؔ اس معاملے خوش نصیب رہے کہ نئی نظم کے حوالے سے اردو ادب نے انھیں ایک خاص مقام عطا کیا بے شک ان کے مرنے کے بعد سہی۔ انھوں نے نئی نظم کے لیے امکانات کی ایک وسیع دنیا کے مختلف در وا کیے ہیں۔ وہ تمام عمر اپنی روح کا کرب، تنہائی کا کرب، محبت کا کرب، زندگی کا کرب اور معاشرے کی نا رسائی کا کرب اپنے اشعار کے سانچے میں ڈھالتے رہے اور میدان شاعری میں اپنا نام امر کر گئے۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر ناصر عباسی نیر ''مجید امجد، شخصیت اور فن'' اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸، ص ۴۲۔۴۱

۲۔ فرّخ درانی ''اداس لمحوں، اداس شاموں کا شاعر'' مشمولہ ''قند'' مجید امجد نمبر، جلد ۳، شمارہ ۸۔۹ پشاور، مئی۔ جون ۱۹۷۵، ص ۲۶

۳۔ مجید امجد ''غزل'' مشمولہ ''کلیات مجید'' الحمد پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۱۴۲

۴۔ ''بن کی چڑیا'' ص ۹۳

۵۔ فرخ درانی ''اداس لمحوں، اداس شاموں کا شاعر'' ص ۲۶

۶۔ مجید امجد ''پنواڑی'' مشمولہ ''کلیات مجید'' ص ۸۸

۷۔ ''ریوڑ'' ص ۱۰۷

۹۔ ''یہی دنیا'' ص ۲۰۳

۱۰۔ ''ریڈنگ روم'' ص ۲۶۴

۱۱۔ سہیل احمد ''مجید امجد اور نئی صورتحال'' مشمولہ ''قند'' ص ۶۹

۱۲۔ مجید امجد ''یہ سرسبز پیڑوں کے سائے'' مشمولہ ''کلیات مجید'' ص ۴۳۵

۱۳۔ ''توسیع شہر'' ص ۳۵۲

۱۴۔ ''خدا'' ص ۵۱

۱۵۔ ''بس اسٹینڈ پر'' ص ۱۵۲

۱۶۔ ''شاعر'' ص ۴۳

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ مجید امجد ''آٹوگراف'' ص۱۵۳

۱۹۔ مجید امجد ''تیرے بغیر'' ص۲۰۰

۲۰۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر ''مجید امجد، شخصیت اور فن'' ص۲۱

۲۱۔ مجید امجد ''نذر محبت'' ص۱۹۵

۲۲۔ ''بندا'' ص۴۹

۲۳۔ ''سوکھا تنہا پتا'' ص۶۱

۲۴۔ ''خودکشی'' ص۵۷

۲۵۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر ''مجید امجد، شخصیت اور فن'' ص۵۳

۲۶۔ مجید امجد ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' ص۳۳۶

۲۷۔ ''مقبرہ جہانگیر'' ص۱۵۷

۲۸۔ ''درس ایام'' ص۱۲۸

۲۹۔ ''کلبہ وایوان'' ص۷۸

۳۰۔ ''لہرانقلاب'' ص ۱۹۲

۳۱۔ ''متروکہ مکان'' ص۳۶۶

۳۲۔ ''۸جنوری۱۹۷۲'' ص۶۳۱

۳۳۔ ''دورنو'' ص۱۲۰

۳۴۔ ''بے ربط'' ص۴۸۷

۳۵۔ ''نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب'' ص۲۸۷

۳۶۔ ''شاعر'' ص۴۲

۳۷۔ ''یہ سب دن'' ص۴۷۷

۳۸۔ ''جدھر جدھر بھی'' ص۵۰۶

۳۹۔ ''ایک نظم'' ص۹۱

۴۰۔ ''پچاسویں پت جھڑ'' ص۴۲۲

۴۱۔ ''سفر درد'' ص۳۵۵

۴۲۔ ''یہ سچ ہے'' ص۲۲۱

۴۳۔ ایضاً